

# انسانیت کی تعمیر نو اور اسلام

(عبد الحمید)

(۲)

تہذیبِ الحاد کے ان سارے عناصر نے انسانیت کے اچھے احساسات، پاکیزہ جذبات اور اخلاقی اقدار کو تباہ کرنے میں جو حصہ لیا ہے اس سے کچھ بڑھ چڑھ کر کام معاشرتی ارتقاء کے نظریہ نے کیا ہے۔ مادیت پرستی کے بطن سے یہ نظریہ پیدا ہوا، افادی طرزِ فکر (Utilitarian point of view) نے اسے پروان چڑھایا اور زمان و مکان پر انسانیت کی فتح نے اسے شبابِ جاودا بخشا۔ اس کی پرورش میں کانٹ (Kant)، فیشٹے (Fichte)، ہیگل (Hegel)، مارکس (Marx) اور اسی طرز کے بیشمار اصحاب فکر نے حصہ لیا۔ اس کے برومند ہونے کے ساتھ ہی ظلم نے انصاف کا شیطنت نے شرافت کا روپ دھار لیا۔ پھر خونریزی، سفاکی، زبردست آزاری، انسانی اخلاق کے نوامیس عالیہ قرار پائے۔

یہ مختصر سا مقالہ کسی تفصیلی بحث کا متحمل نہیں ہو سکتا، اس لیے ہم نہایت ہی اختصار کے ساتھ یہ بتائیں گے کہ یہ نظریہ کن افکار سے عبارت ہے۔ اس ضمن میں ہم اپنی گفتگو کا آغاز ہیگل سے کرتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے اگرچہ یہ نظریہ دنیا میں صدیوں سے موجود ہے مگر جس مفکر نے فکر کی پوری گہرائی اور استدلال کی پوری قوت کے ساتھ اس کو ایک واضح اور مربوط و مبسوط شکل میں دنیا کے سامنے پیش کیا وہ ہیگل ہی تھا۔

فلسفہ تاریخ کے طالب علم کے لیے یہ ایک عجوبہ ہے کہ کانٹ کے نظامِ فکر کی جس زور سے جرمنی کا یہ ہونہار فلسفی تردید کرتا ہے اس سے کہیں زیادہ محنت اور کاوش کے ساتھ وہ اس کی تائید بھی کرتا ہے۔ لے جن کا ذکر پچھلے شمارے میں کیا جا چکا ہے۔

اُس کے بے رنگ خانوں میں استدلال کے رنگ بھرتا رہے اور اس طرز خیال کو پائیدار تکمیل تک پہنچانا ہے جس کو عقلیت کے رت شکن نے شروع کیا تھا۔

فلسفے کی فنی پیچیدگیوں سے بچتے ہوئے ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ہیگل کے نزدیک انسانی تہذیب و تمدن کا ارتقاء حاصل اضداد کے ظہور، تضادم اور امتزاج سے واقع ہوتا ہے۔ تاریخ انسانی کا ہر دور ایک وحدت، ایک کل ہے۔ اس دور میں انسانی زندگی کے مختلف شعبے مثلاً معاشی، سیاسی، تمدنی اور اخلاقی و عقلی اور مذہبی تصورات ایک خاص مرتبے پر ہوتے ہیں ان سب کے اندر ایک گہرا ربط ہوتا ہے اور یہ سارے ایک عصری وحدت کے رخِ زیبا کا عکس ہوتے ہیں۔ جب تاریخ انسانی کا قافلہ صریح مطلق کے اشارہ پر کچھ قدم آگے بڑھتا ہے تو خود اس کے اپنے کیمپوں میں سے کچھ حریفانہ افکار، رجحانات اور نظریات علم بغاوت بلند کرتے ہیں میدانِ جنگ میں آجاتے ہیں۔ ان دونوں کے درمیان ایک زبردست لڑائی شروع ہوتی ہے مگر کچھ مدت ایک دوسرے سے برسرِ پیکار رہنے کے بعد ان میں آخر کار صلح ہو جاتی ہے اور دونوں گروہ اپنے میں سے کمزور عناصر کو چھانٹ کر علیحدہ کر دیتے ہیں اور اس کے بعد ایک ایسی وحدت کو جنم دیتے ہیں جو دونوں گروہوں کے صالح عناصر پر مشتمل ہوتی ہے۔ یہ وحدت ایک بالکل نئے نظامِ فکر و عمل کی حیثیت سے آگے بڑھتی ہے۔ کچھ مدت گزر جانے کے بعد اس کا بھی یہی حشر ہوتا ہے اور انسانی تہذیب اس طرح ترقی کرتی چلی جاتی ہے۔

اسی عمل ارتقاء کو ہیگل اپنی مخصوص اصطلاح میں جدلی عمل (Dialectical process) کہتا ہے۔ اس کے نزدیک حصّہ تاریخ یا میدانِ دہر میں گویا ایک مسلسل منطقی مناظرہ و مجادلہ ہوتا ہے اور اسی کی قوت سے انسانیت ترقی کی منازل طے کر رہی ہے۔ پہلے ایک دعویٰ Thesis سامنے آتا ہے۔ پھر اُس کے مقابلے میں جوابی دعویٰ Antithesis پیش ہوتا ہے۔ پھر ایک طویل جھگڑے کے بعد دوجہ مطلق ان میں مصالحت کرانی ہے اور اس طرح ایک ایسی وحدت معرض وجود میں آتی ہے جو پہلی وحدتوں کے مقابلے میں ہر لحاظ سے افضل و اکمل ہوتی ہے۔ کیونکہ اس میں ان

سب کے صالح اجزا شامل ہوتے ہیں۔ لہذا انسانیت جو قدم بھی اٹھاتی ہے وہ ہمیشہ آگے ہی بڑھتا ہے۔  
یہ ہے میگل کا نظریہ ارتقاء

مارکس نے اپنا فکری خاکہ میگل سے مستعار لیا مگر اس میں خود اپنے وجدان سے رنگ بھرے۔  
اس نے روح کے تصور کو الگ کرتے ہوئے مادی اسباب یا معاشی محرکات کو تاریخی ارتقاء کی بنیاد قرار  
دیا۔ میگل کے نزدیک اگر نوثر طاقت انکار کی ہے تو اس کے نزدیک اصل اور فیصلہ کن قوت صرف  
مادی ماحول ہے اور اس میں بھی حقیقی اہمیت فزائے پیداوار کو حاصل ہے۔ میگل کے خیال کے مطابق  
انسان کی جنگ تصورات کے ایوانوں میں لڑی جاتی ہے۔ مگر مارکس یہ سمجھتا ہے کہ زندگی کی اصل رزم گاہ  
معاشی میدان ہے اور اسی میں انسانیت کی قسمت کے فیصلے ہوتے ہیں۔ کیونکہ انسانی زندگی میں سب  
سے زیادہ اہم چیز معیشت ہے اور یہی وہ بنیاد ہے جس پر انسان کے اخلاقی اور مذہبی معتقدات اور  
اس کے تمدن اور اس کے علوم و فنون کی بالائی عمارت تعمیر ہوتی ہے۔ پیدائش دولت کے مختلف  
طریقے ہی کسی دور کی ذہنی اور سیاسی زندگی کا ہیولی تیار کرتے ہیں۔ انسانیت کے ارتقاء کی اس  
کے نزدیک یہ صورت ہے کہ پہلے معاشی پیداوار (Production) کے طریقوں میں ایک  
تبدیلی ہوتی ہے۔ اس کا براہ راست اثر اسباب زندگی کی تقسیم اور ملکیتی تعلقات پر پڑتا ہے اور اس  
سے زندگی کی ساری قدیں از خود بدل جاتی ہیں۔ اور اس طرح ایک نیا نظام وجود میں آتا ہے۔ اب  
ان دونوں نظاموں میں میگل کے جدلی عمل کی طرح کشمکش شروع ہوتی ہے اور بالآخر وہ صلح پر آمادہ  
ہو جاتے ہیں اور اس کے بعد دونوں مل کر ایک ایسے نظام کی بنیاد رکھتے ہیں جس میں تمام صالح اجزا  
شامل ہوں۔ ظاہر ہے کہ ایسا نظام پہلے نظاموں سے ہر لحاظ سے بہتر ہوتا ہے۔ اسی طریق سے  
انسانیت کا ارتقاء ہو رہا ہے۔

تیسرا مفکر جس نے اپنے طرز فکر سے معاشرتی ارتقاء کے نظریہ کو ایک زبردست قوت فراہم  
کی وہ ڈارون ہے۔ اس کا خیال ہے کہ جانداروں کے اندر غیر محدود طور پر بڑھنے، ترقی کرنے اور شکل و  
صورت میں تغیر کرنے کا ایک قدرتی رجحان پایا جاتا ہے۔ لیکن انواع حیوانات کا ارتقاء قدرت کے



کسی تعمیری عمل کا رہن منت نہیں بلکہ تخریبی عمل کا نتیجہ ہے۔ کیونکہ وہ حیوانات کی باہمی جنگ، قحط اور موت کے بغیر ممکن نہیں ہوتا۔ مانتھس کے نظریہ آبادی پر بغیر سوچے سمجھے ایمان لاکر اس نے یہ نتیجہ نکالا کہ چونکہ جانداروں کی تعداد و خوراک اور قیام حیات کی دوسری احتیاجات کی نسبت بہت عمرت سے بڑھتی ہے، اس لیے ہر جاندار کو اپنے بقا کے لیے دوسروں سے مسلسل جنگ کرنا پڑتی ہے۔

ڈارون کا نئٹات کو ایک میدان کا نزار کی حیثیت سے دیکھتا ہے، جس میں ہر آن، ہر طرف زندگی اور بقا کے لیے طاقتور کمزوروں کو ختم کرنے میں مصروف ہیں۔ لہذا جو جاندار اپنے دشمنوں سے بہتر جسمانی طاقتوں کا مالک ہے وہی زندہ رہتا ہے۔ اور اصل میں وہی زندگی کی نعمت کا صحیح طور پر مستحق بھی ہے۔ اس بے رحم نظام میں جو فنا ہوتا ہے وہ اس لیے فنا ہوتا ہے کہ وہ کمزور ہے۔

الغرض زمین اور اس کا ماحول اور اس کے وسائل زندگی صرف طاقتور کے وجود کو برداشت کرتے ہیں، کمزوروں کے لیے یہاں کوئی جگہ نہیں اور انہیں چاہیے کہ وہ اس کائنات کو اپنے ناتوان وجود سے جلد از جلد پاک کر دیں۔ اس طرح حالات کی مجبوری سے ارتقاء شروع ہوتا ہے اور ایک مسلسل کشمکش کے ذریعہ بلند تر حیوانات پیدا کرتا ہے۔ انسان بھی جدوجہد کی انہی پُرسپچ راہوں سے گزرتا ہوا انسانیت کی بلندی تک پہنچا ہے۔ جو کوئی بھی تنازع للبقا کی بھٹی میں سے کامیابی کے ساتھ گزر جاتا ہے وہ صالح ہے اور کائنات اپنی آغوش صرف اسی کے لیے کھولتی ہے۔

اب ان تینوں مفکرین کے افکار کو جمع کرنے سے معاشرتی ارتقاء کا جو نظریہ وجود میں آتا

ہے اُس کے بڑے بڑے اصول یہ ہیں۔

- زندگی میں ارتقاء صرف کشمکش کی وجہ سے ہو رہا ہے۔
- اسی کشمکش کے نتیجے میں انسانیت ترقی کرتی ہے۔
- اس کائنات میں جینے اور ترقی کرنے کا حق صرف اسی کو ہے جو زیادہ سے زیادہ قوت کا مظاہرہ کرے۔
- یہاں اصل مقصد کامیابی ہے خواہ وہ کسی طریق سے حاصل ہو۔

اس مضمون میں ہمارے پیش نظر اس نظریہ کی فکری لغزشوں کی نشاندہی نہیں بلکہ ہمیں جو کچھ بتانا مقصود ہے وہ یہ ہے کہ اس طرز فکر نے انسانیت کی یہ بد خدمتی کی ہے کہ انسان کو انسان بنانے کی بجائے زندہ بنا دیا ہے اور دنیا کو حبت بنانے کی بجائے جہنم بنا ڈالا ہے۔

اس کا پہلا اثر جو انسانیت نے قبول کیا ہے وہ یہ ہے کہ انسان کی مادی ترقی ہی انسانی زندگی کا معراج ٹھہری ہے۔ حالانکہ اگر غور سے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ یہ مادی ارتقاء شعور انسانی کی مدد کے لیے ہے، اس میں از خود تخلیق کی صلاحیت نہیں نفس انسانی کی تخلیق کا اصلی محرک اندرونی روحانی جذبہ ہے یہی وہ مقام ہے جہاں اس نظریہ کے حامیوں نے ایک زبردست ٹھوکر کھائی۔ اب جبکہ انسانیت کے ارتقاء سے مراد صرف مادی ارتقاء ہے تو ضروری ہے کہ انسانیت کے مختلف گروہ اور طبقے مادی اسباب کی فراہمی کے لیے دیوانہ وار جدوجہد کریں اور اس سلسلے میں کسی اخلاقی ضابطے کے پابند نہ ہوں۔ کیونکہ اگر وہ ایسا نہیں کرتے تو خود موت کو دعوت دیتے ہیں۔ اسی طرز خیال نے لوگوں کے اندر ایک مستقل خوفزدگی کی کیفیت پیدا کر دی ہے۔ فریبیہ قوم سب کے دل پر اسی خونخوار جذبے کا پورا تسلط دکھائی دیتا ہے اور سب لوگ ایک دوسرے سے لڑاں اور لڑساں نظر آتے ہیں۔ اس مسلسل خوف نے انسانیت کے اندر نہایت ہی ذلیل خصائص کو ابھرایا ہے۔ مثلاً خود غرضی، سنگدلی، بخل، تنگ نظری، بد عہدی، حیانت اور بیاکاری۔ عہد حاضر کے ماہرین نفسیات نے اپنے انکشافات سے اس حقیقت کو ثابت کیا ہے کہ انسان کے وہ احوال جن کی غایت اپنی قوت کا اظہار ہے ان کے پیچھے خوف کا جذبہ ہی کارفرما ہوتا ہے۔ لہذا یہ فوجی قوت کی بے جا نمائش، خسروانہ جلال، اور غیر مسئول اقتدار کی ہوس سب اسی جذبے کا نتیجہ ہیں۔

دوسرے اس طرز خیال نے انسانیت کے مستقبل کو سرسبز و سرسبز کر دیا ہے۔ جو فلسفہ انسانی ایچو (۱۹۳۰ء) کے عمل تخلیق کی توجیہ زمان و مکان کے ذریعے سے کرے وہ انسان کو کائنات کے قواعد و حدود تو بتا سکتا ہے مگر اس کی زنجیروں سے انسان کو کبھی نجات نہیں دلا سکتا یہی وجہ ہے کہ موجودہ انسان اپنے مستقبل کے بارے میں روز بروز مایوس ہوتا جا رہا ہے۔ مشہور اطالوی مفکر

کو دیکھئے (Croce) اس کے متعلق اظہارِ خیال کرتے ہوئے کہتا ہے :-

”انسانیت پر کئی باریاسیت کی پرچھائیں پڑی اور اس میں کوئی شبہ نہیں کہ تاریخِ انسانی میں بے شمار آوار ایسے آئے ہیں جب انسان شک اور مایوسی کا شکار ہوا۔ مگر دورِ جدید میں بے سائے بڑھتے جا رہے ہیں۔ فلاسفہ یا وہ لوگ جن کی نگاہیں دور رس ہوتی ہیں وہ فلسفیانہ اور تاریخی حقائق کی بنا پر یہ پیشگوئی کر رہے ہیں کہ انسانیت کا فائدہ نہایت ہی خطرناک اور جہیب غامض کی طرف جا رہا ہے۔ . . . اس کا سبب یہ ہے کہ ہم یہ سمجھ بیٹھے ہیں کہ اس کائنات میں صرف ایسی قوتیں ہی کارفرما ہیں جو تمام تر خارج میں واقع ہیں۔ اور نئے بندھے قوانین کے مطابق مصروفِ عمل ہیں۔ ان قوتوں کے مقابلہ میں ہم اپنے آپ کو بالکل بے بس پاتے ہیں۔ ہمارے لیے امید کی اگر کوئی جھلک ہے تو صرف یہی کہ ہم خارجی دنیا میں ایسی قوتوں کا پتہ لگائیں جو یا تو بالکل مخالف سمت میں اپنا عمل جاری کریں، یا ان کو شکست دیں یا ان کی کارفرمائی کو کسی طرح روک دیں۔ مگر یہ خیال خام ہے کیونکہ اس میں بھی ہمارا اسلحہ انحصارِ غیروں پر ہے۔“

تفسیر ہے چونکہ یہ نظریہ جس اساس پر قائم ہے وہ یہ ہے کہ انسانیت کا ارتقا یا بھی کشمکش کی وجہ سے ہو رہا ہے اس لیے انسان میں تعاون کے احساسات ابھرنے کی بجائے مخالفت اور حسد کے جذبات بھڑکنے چاہئیں۔ یہ نظریہ انسانیت کو یہ تعلیم دیتا ہے کہ اگر تمہیں دنیا میں چلنا چھوٹا ہے تو تمہیں اپنا سب کچھ اس کشمکش میں جھونک دینا چاہیے۔ یہی وجہ ہے کہ موجودہ انسان بالکل بے رحم اور سنگدل بن گیا ہے۔ اس کی رو سے اگر کوئی قوی کسی کمزور کو پامال کر کے آگے بڑھتا ہے تو وہ عین فطرت کے تقاضوں کو ٹپدا کر رہا ہے۔ وہ اپنی صلاحیتوں سے یہ ثابت کر رہا ہے کہ جینے کا حق صرف اسی کو ہے۔ اس کے برعکس اگر کوئی کمزور ظلم سہتا ہے اور قوت کے پاؤں تلے پامال ہوتا ہے تو وہ اسی قابل ہے کہ اس کے ساتھ یہ سلوک کیا جائے۔ اس نظریہ نے نہ صرف انسانیت کو جاہل



اور ظالم بنا دیا ہے بلکہ ہر صاحب قوت کو برحق ثابت کر کے اس نے سرمایہ داری اور استعماریت کے لیے عقلی زمین فراہم کر دی ہے۔ لڑنے جھگڑنے کا کام اگرچہ پہلے بھی انسان کرتا رہا ہے مگر پہلے اسے شتر سمجھ کر کیا جاتا تھا، اس فلسفہ نے اسے سرمایہ خیز میں تبدیل کر دیا ہے پہلے لوگ ظلم کرنے والے کو ظالم سمجھتے تھے مگر اب اسے عادل تصور کیا جاتا ہے، ماکس ایسٹمین (Max Eastman) نے جو بات تاریخ کی مادی تعبیر کے متعلق کہی ہے وہ درحقیقت معاشرتی ارتقا کے پورے فلسفہ پر صادق آتی ہے۔ وہ کہتا ہے:-

” اس نظریہ نے ماریکیوں کو ان کے انسان دوستی کے سارے بلند بانگ و عہدوں کے باوجود متکبر اور تشدد و تلبیا ہے۔ کیونکہ اس کی بنیادی تعلیم یہی ہے کہ انسان ایک سخت اور شدید قسم کی کشمکش کے ذریعے ہی ترقی حاصل کرتا ہے۔ یہاں نیکی اور بدی دو مختلف قوتوں کے دو مختلف نام ہیں، جن کے مابین جنگ و جدال کے نتیجے میں انسان کو مقام محمود حاصل ہوتا ہے۔“

اسی طرح ایک فرانسیسی مصنف ( Boris Sovraine ) نے بتایا ہے:-

” انسانیت کا احترام دلوں سے مٹ گیا ہے۔ زندگی اپنی حقیقی قدر و قیمت کھو بیٹھی ہے۔ آج کوئی ظالموں کی بہیمیت کو ختم کرنے کی ہمت نہیں رکھتا، واقعہ یہ ہے کہ زندگی اپنی انتہا کو پہنچ چکی ہے۔“

ایک اور مصنف کینیڈا کا ( Kenneth Walker ) اپنی کتاب ”معنی اور

مقصد“ ( Meaning and Purpose ) میں ڈارون کے نظریہ ارتقاء کا ذکر کرتے ہوئے کہتا ہے:-

” تریشکے ( Trietschke ) اور برن ہارڈی ( Bernhardi )

نے جنگ و جدال کی جو عظمت بیان کی ہے وہ ٹمرہ ہے ڈارونیت کی المانوی توجیہ کا انگلستان

۱ Benedetto Croce : Politics and Morals

۲ Max Eastman : Stalin's Russia

میں، جو نیپولین کے قول کے مطابق افواج سے نہیں بلکہ دکانداروں سے آباد ہے۔ انتخاب طبعی کے تصور نے ایک بدترین معاشی رقابت اور مزدوروں کی طرف سے ایک نجرمانہ تفاعل کے لیے درجہ جواز فراہم کی ہے۔

پھر اس تصور حیات نے لوگوں کے دلوں میں اس خیال کو راسخ کر دیا ہے کہ ہر قسم کی حرکت اور کشمکش بشرطیکہ وہ مادی اعتبار سے کامیاب ہو، انسانی ارتقاء کی ضمانت ہے۔ اس خیال کا نتیجہ یہ ہوا کہ انسان نے حق اور انصاف کی بجائے قوت اور طاقت کی پرستش شروع کی۔ اس نے اپنی ذہانت اور طباعی کو ایسے امور کے دریافت کرنے میں صرف کیا جس سے اس کی قوت اور طاقت میں اضافہ ہو۔ جارحانہ ملکیت اور ظالمانہ امپیریلزم اسی تصور کے شاخسانے ہیں۔ اس نظریہ نے تاریخ انسانی کے ناسیک ترین ابواب کو روشن بنا دیا ہے۔ ہیگلی فلسفے کے ایک مشہور نقاد کروشے (Croce) نے بالکل سچ کہا ہے :-

اس طرز خیال میں قدامت پرستی، انقلاب انگیزی، اور بحالی (Restoration)

الغرض سب کے لیے سب جواز موجود ہے۔

اسی طرح ایک دوسرے تعاون رکھا ہے :-

۔۔ اس نظریہ نے مارکسی مصنفین کو یہ موقع دیا ہے کہ وہ زندگی کے ہر معاملے میں اپنے

آپ کو برحق ثابت کریں۔ یہی تصور موجودہ ددیر میں ظلم و ستم کا سب سے بڑا سبب ہے۔

سب سے آخر میں اس طرز فکر نے لوگوں کو مذہب و اخلاق کی اجتماعی حیثیت سے انکار کرنے کا درس

دیا۔ اس نے انسانوں کو یہ تعلیم دی کہ ان کا فرض یہی ہے کہ وہ ہمیشہ اپنے بقا و استحکام، اور حصول

قوت و اقتدار کے لیے کوشاں رہے و چاہے وہ کسی طور پر بھی حاصل ہو۔ اگر یہ مقصد مذہب و اخلاق

کی پیروی سے حاصل ہو تو اسے اختیار کر لیا جائے، مگر اس کے برعکس اگر کامیابی ان کو ترک کرنے سے

☞ Benedetto Croce: What is Living and what is Dead of the

Philosophy of Hegel

of

Max Eastman



حاصل ہوتی ہو تو انہیں تی الفور نظر انداز کر دینا چاہیے۔ پچھلی چار صدیوں میں "باطل پرست فلاں سادی حکیم" ٹیکیا دلی کی تعلیم کو جو قبول عام نصیب ہوا اس کی بڑی وجہ یہی نظر یہ ہے۔ ڈاکٹر فنک (Funk) اور گو بلز (Goebbels) کے مندرجہ ذیل الفاظ اس فکر کی صحیح طور پر ترجمانی کرتے ہیں:-

”ساری قوت اور طاقت کا مقصد صرف ایک ہے کہ ہر جائز و ناجائز طریقے کو استعمال میں

لا کر مخالف کو شکست دی جائے۔ ہماری تحریک مذہب کے پیش کردہ اخلاقی قیود سے یکسر آزاد ہے۔

ہر وہ عمل جو استعماریت کے قلعے کو سمار کرنے کے لیے کیا جائے وہ اخلاقی فعل ہے“

یہ میں مختصر الفاظ میں مغربی تہذیب کے عناصر ترکیبی اور ان کے انسانی زندگی پر اثرات۔ دورِ حاضر کا انسان آجکل ایک گہری سوچ میں ڈوبا ہوا ہے۔ وہ سوچتا ہے کہ آخر کیا وجہ ہے کہ وہ علم و فن کی ترقی کے باوجود، مادی سر و سامان کی فراوانی کے ہوتے ہوئے بھی دکھی ہے۔ زمین ہر سال اربوں ٹن غلہ اگلتی ہے، مگر اس کے باوجود اس کے ابنائے نوع بھوک کا شکار ہیں۔ علوم و فنون کے آن گنت سرچشے جاری ہیں، مگر انسان پھر بھی جاہل ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ انسان نے جس جنت کے لیے تین چار صدیوں کا جانکاه سفر طے کیا ہے وہ اسے اس کی منزل مقصود سے بہت دور لے گیا ہے۔ علامہ اقبال مرحوم نے اپنے ایک پیغام میں جو انہوں نے یکم جنوری ۱۹۳۵ء میں سال نو کے موقع پر دیا اس تہذیبِ الحاد کی ناکامی کا تذکرہ کرتے ہوئے فرمایا:-

”دورِ حاضر کو علوم عقلیہ اور سائنس کی عظیم مثال ترقی پر بڑا فخر ہے اور یہ فخر و ناز یقیناً حق بجانب ہے۔

آج زمان و مکان کی پہنائیاں سمٹ رہی ہیں اور انسان نے فطرت کے اسرار کی نقاب کشائی اور تسخیر میں

حیرت انگیز کامیابی حاصل کی ہے۔ لیکن اس تمام ترقی کے باوجود اس زمانے میں ملوکیت کے جبر و استبداد

نے جمہوریت، قومیت، اشتراکیت، فسطائیت کے نہ جانے کون کون سے نقاب اوڑھ رکھے ہیں ان

نقابوں کی آڑ میں دنیا بھر میں قدرِ حریت اور شرفِ انسانیت کی ایسی مٹی پلید ہو رہی ہے کہ تاریخ عالم

کا کوئی تاریخ سے تاریک صفحہ بھی اس کی مثال پیش نہیں کر سکتا۔“

اسی طرح انہوں نے موجودہ انسان کی بے کسی اور بے بسی کا جن واضح الفاظ میں نقشہ کھینچا ہے، وہ

ایک نہایت گہرے غور و فکر کے مستحق ہیں۔ وہ ارشاد فرماتے ہیں:

عشق ناپید خسرو می گزوش صورت مار

عقل کو تابع فرمان نظر کرنے سکا

ڈھونڈنے والا ستاروں کی گزرگاہوں کا

اپنے انکار کی دنیا میں سفر کرنے سکا

اپنی حکمت کے خشم و سپج میں الجھا ایسا

آج تک فیصلہ نفع و ضرر کرنے سکا

جس نے سورج کی شعاعوں کو گرفتار کیا

زندگی کی شب تاریک سحر کرنے سکا

تہذیب الحاد کے عناصر کا ذکر کرنے کے بعد اب ہم ان اجتماعی تحریکات کا جائزہ لیں گے جو اس تہذیب کے سائے میں پروان چڑھی ہیں اور جن سے ہمیں اس وقت سابقہ درپیش ہے۔ یہ تحریکات اگرچہ ناموں کے اعتبار سے مختلف ہیں مگر ان سب میں اسی مادہ تہذیب کی روح جاری و ساری ہے۔

## سرمایہ دارانہ جمہوریت

تہذیب الحاد کے اتق پر جو تحریک سب سے پہلے نمودار ہوئی وہ سرمایہ دارانہ جمہوریت ہے۔ آغاز میں اس کے متعلق لوگ بڑی خوش فہمیوں میں مبتلا تھے۔ وہ سمجھتے تھے کہ اس طرز حکومت کے معرض وجود میں آتے ہی انہیں اطمینان اور چین کا سانس نصیب ہوگا۔ مگر افسوس کہ توقعات کے یہ سائے خواب اور امیدوں کے یہ خیالی خاکے قلب و نگاہ کو تپری طرح نشاط و آسودگی بخشنے بھی نہ پائے تھے کہ اس کی تلخیوں کا احساس ہونے لگا۔ جب یہ خواب مجاز آشنائے تعبیر ہوا تو اس نے لوگوں کو سکون عطا کرنے کی بجائے ان کا ہراس چین بھی لوٹ لیا۔ اس نئی تحریک کے سارے دعووں کے باوجود زندگی ہر آن تلخ سے تلخ تر ہوتی گئی۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اس نے عوام کو قیصریت، پاپائیت اور جاگیرداری کے ظالمانہ تسلط سے

کسی حد تک آزاد کیا، مگر اس کے ساتھ ہی اس نے تلوار کے خوف سے نہیں بلکہ اخلاص کے دیو سے لوگوں کو اس طرح ڈرایا کہ لوگ خوفزدہ ہو کر از خود اپنے آپ کو مالکانِ رزق کی تحویل میں دینے کے لیے رضامند ہو گئے۔ یہ لوگ کمزوروں کی بے بسی سے اسی طرح فائدہ اٹھاتے جس طرح کہ قرون وسطیٰ کے شہنشاہ اور جاگیردار۔

تحقیقِ ربانی ( Divine Right of Kingship ) کے نظریہ کی جگہ بیشک معاہدہ عسکرانی ( Social contract ) کے نظریہ کو قبولِ عام نصیب ہوا مگر نظریات کی یہ تبدیلی حالات کو کسی صورت بھی بہتر نہ بنا سکی۔ آج بھی حکومتوں کی زمامِ کار عملاً چند مطلق العنان اشخاص کے ہاتھوں میں ہے۔ اور اب نوبت یہاں تک پہنچی ہے کہ دو تمدنِ انسانوں کا ایک مختصر گروہ یہ طاقت رکھتا ہے کہ وہ نہ صرف اپنے ملک کے انسانوں کو بلکہ پوری نوبِ انسانی کو اپنے قوت و اقتدار سے بے زبان گلے کی طرح میکانیکی طور پر جبر چاہے گھاٹے۔ اس طبقے کی قوت و جبروت کے ہمیشہ علم کبے بس اور دکھی انسانیت آج غمزدہ اور اشکبار آنکھوں سے دیکھ رہی ہے مگر اس سے نجات حاصل کرنے کے لیے کوئی راہ نہیں پاتی۔

ہیرلڈ لاسکی ( Harold Laski ) اسی حقیقت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہتا ہے:-

”حریت سے مراد آج آزادیِ مطلق نہیں، بلکہ اس کا مطلب قانون کے دائرے میں ایک محدود اختیار ہے، قانون کا مقصد صرف یہ ہے کہ وہ ناجائز انتفاع کرنے والوں کی ایک قلیل جماعت کے مفادات کی حفاظت کر لے۔“

یہاں ہم ایک بات کی وضاحت کر دینا ضروری سمجھتے ہیں کہ سرمایہ دارانہ جمہوریت سے بعض لوگ صرف ایک خاص قسم کی سیاسی سٹیٹ مراد لیتے ہیں۔ یہ ایک خام خیالی ہے جس میں اکثر لوگ مبتلا ہیں۔ سرمایہ دارانہ جمہوریت ایک مکمل فلسفہٴ حیات اور ایک پورا نظامِ زندگی ہے جو زندگی کے تمام شعبوں پر حاوی ہے۔ پروفیسر ڈوئی ( Dewey ) اپنی کتاب ”اخلاقِ جمہوریت“ ( Ethics of Democracy ) میں اس خیال کی تردید کرتے ہوئے لکھتا ہے:-

”یہ کہنا کہ جمہوریت صرف ایک خاص طرز کی حکومت ہے بالکل اسی طرح ہے اگر یہ کہا جائے



کہ مکان صرف اینٹوں کا مجموعہ ہے یا اگر جا ایک ایسی عمارت کا نام ہے جو کلس اور منبر پر مشتمل ہو۔  
 سرمایہ دارانہ جمہوریت کا صحیح طور پر تجزیہ کرنے کے لئے ناگزیر ہے کہ ہم اس کے مختلف پہلوؤں کا  
 جائزہ لیں۔ اس لیے ہم سب سے پہلے اس تحریک کے صرف سیاسی پہلو کا جائزہ لیتے ہیں۔  
 اس تحریک کا رفیع الشان قصہ جس بنیاد پر اٹھایا گیا ہے وہ یہ ہے کہ مملکتی اقتدار کا اصل منبع مشیت  
 عامہ (General Will) ہے جو اکثریت رائے سے متعین ہوتی ہے۔ یہ مشیت عامہ سیاہ و  
 سفید کی مالک ہوتی ہے۔ وہ غیر اخلاقی افعال کو اخلاقی اور ناطق کو حق قرار دینے کی پورے طور پر مجاز ہے۔  
 اس نظریہ کی ترتیب میں ہابز (Hobbes)، لاک (Locke) اور روسو (Rousseau) ایسے  
 بلند پایہ مفکرین نے حصہ لیا۔ یہ خیال کہ حکومت عوام کی مرضی کے مطابق ہونی چاہیے آنا پرانا ہے جتنی کہ  
 مدنی الطبع انسان کی عمرانی زندگی کی تاریخ۔ انسان شروع ہی سے اس بات کا متمنی رہا ہے کہ اُس پر اُس کے  
 حسبِ مشا حکومت کی جائے۔ جو چیزیں اُسے مرغوب ہیں انہیں قانونی حیثیت دی جائے اور جو اُس پر ہار  
 ہوں انہیں قانون کے دائرے سے نکال دیا جائے۔ مگر زمانہ کے ساتھ ساتھ یہ تصور وسیع سے وسیع تر ہوتا  
 گیا حتیٰ کہ اٹھارویں صدی میں یہ طے پایا کہ مملکت کے پیش نظر سب سے بڑا اور اہم مقصد مفاد عامہ کی حفاظت  
 ہے اور اقتدار کا اصل سرچشمہ حکومت نہیں بلکہ ملک کے عوام ہیں۔ ان مختلف اجزاء کے مرکب مملکت کا  
 جو نیا نظریہ تیار ہوا ہے وہ اپنے خصائص کے اعتبار سے سابقہ سارے نظریوں سے مختلف ہے۔ اس کی  
 رو سے محکوم کے سر پر حاکمیت کا تاج رکھا گیا ہے۔ پروفیسر ہرن شا (Hearnshaw) جمہوریت  
 کی تعریف کرتے ہوئے لکھتا ہے:

”سیاسی نقطہ نظر سے جمہوریت کا مفہوم صرف اسی قدر ہے کہ قوم بحیثیت مجموعی حاکمیت  
 کے فرائض سرانجام دے۔“

اسی حقیقت کو دوسرے الفاظ میں ہم یوں بیان کر سکتے ہیں کہ جمہوری نظام حکومت میں ملک کی  
 آبادی خود اپنی رضامندی سے مملکت کو ایک ایسی قوت قاہرہ (Coercive Power) فراہم

کر کے دیتی ہے جس کی اطاعت ملک کے سارے عوام کرتے ہیں۔ گورنمنٹ جس کے ہاتھ میں ملک کا انتظام ہوتا ہے وہ عوام کی اجتماعی رضامندی کے تابع ہوتی ہے اور اس کا منصب اس کے سوا کچھ نہیں کہ ان کی خواہشات کو وضع قوانین اور تنفیذ قوانین میں رُو عمل لائے۔

اس نظریہ کی کمزوری کو اصحابِ فکر نے بالکل شروع میں ہی بھانپ لیا تھا۔ حتیٰ کہ روسیو Rousseau جو اس نظریہ کا سب سے بڑا موید تھا، اُس نے معاہدہ عمرانی (Social Contract) میں بتایا ہے کہ مملکت کے اس تصور کو چھوٹی ریاستوں میں ہی عملی جامہ پہنایا جاسکتا ہے مگر جہاں مملکت کی حدود پھیلی ہوئی ہوں وہاں یہ طرز حکومت کامیابی سے نہیں چل سکتا۔ جوں جوں وقت گزرتا گیا اس نظریہ کی خامیاں خود بخود سطح پر ابھر آئیں حتیٰ کہ اب جمہوریت کے سب سے بڑے حامی بھی تسلیم کرنے پر مجبور ہیں کہ عوامی حاکمیت کا تصور محض ایک سراب ہے۔ (الفرد کابن Alfred Cobban) نے بالکل درست کہا ہے۔

”جمہوریت ایک خیالی محبوبہ ہے جو اگر چہ کنوار ہی ہے مگر بالآخر چھٹی جاتی ہے۔“

اس طرز حکومت کا اگر گہری نظر سے مطالعہ کیا جائے تو یہ حقیقت از خود متکشف ہو جاتی ہے کہ جمہوری نظام اگر اپنے اندر افادیت کے کچھ جوہر رکھتا ہے تو وہ اُسی صورت میں نکھرتے ہیں جب عوام انتہائی ایماں دار، بے لوث، اور بے غرض ہوں۔ جب وہ مفادِ عامہ کے لیے اپنی قیمتی سے قیمتی متاع قربانی کرنے کے لیے ہر وقت تیار ہوں۔ جن کی سیرت نہایت پختہ اور بصیرت نہایت گہری ہو۔ جو اتنے عقلمند اور ذہین ہوں کہ بھلے اور بڑے، حق و ناحق کے درمیان امتیاز کریں اور سلطنت کے مفاد کو کسی قیمت پر بھی نقصان پہنچانے پر مائل نہ ہوں۔ اس کے ساتھ قوم کے مختلف عناصر ایک عضو (Organism) کی طرح مربوط ہونے کے علاوہ اپنی ایک مشیتِ عامہ بھی رکھتے ہوں۔ پروفریئر ڈیزے میونڈ Ramsay Muir کا قول ہے :-

”جمہوریت جس اساس پر قائم ہے وہ یہ ہے کہ لوگ دیانت اور عدل کو سب سے عزیز رکھیں۔“

۱ Social Contract (Book III)

۲ تفصیل کے لیے دیکھیے روسو کی کتاب

۳ Alfred Cobban : The Crisis of Civilization p. 75

۴ Muir : Peers and Bureaucrats p. 154

آئیے اب ہم اس نظام کا کسی تفصیلی جائزہ لے کر دیکھتے ہیں کہ اس میں کہاں کہاں خامیاں موجود ہیں۔ جدید مملکت کی سب سے اہم خصوصیت بلکہ اس کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ اس میں مذہب و اخلاق کی کارفرمائی کو یکسر ختم کر دیا گیا ہے۔ جب تک لوگ اپنی شہری ذمہ داریوں سے کما حقہ عہدہ برآ ہوں مملکت ان سے یہ مطالبہ نہیں کر سکتی کہ وہ کسی نظام اخلاق کے پابند ہوں۔ مملکت کے اس تصور کو سب سے پہلے میکیاؤلی نے پیش کیا جس نے سیاست اور مذہب و اخلاق کو الگ الگ رکھنے کی تلقین کی۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے اگر افراد اپنی زندگی کے معاملات میں کسی مخصوص ضابطہ کے پابند نہ ہوں تو آخر اس کا رزاق حیات میں کون سے اخلاقی اصول ان کی رہنمائی کریں۔ اس کا جواب یہ دیا جاتا ہے کہ ذاتی نفع کا حصول یا با افعال دیگر مادی نفع کی طلب ہی وہ اصل محرک ہے جو لوگوں کو سرگرم عمل کرتا ہے اور ان کے اندر سعی و طلب کا ولولہ اُجھاتا ہے، اسی کی مقدار وہ اصل کسوٹی ہے جس پر انسانی افکار و اعمال کی پرکھ کی جاتی ہے۔ اب جبکہ مادی فوائد و لذائذ کا جمع کرنا زندگی کا سب سے اعلیٰ مقصد قرار پایا ہے، کیا یہ ممکن ہے کہ لوگ زندگی کی تحریکات اور ترقیات سے متاثر ہوئے بغیر عدل و انصاف کے کٹھن راستہ پر گامزن رہیں۔ ظاہر ہے

کہ جب سارے لوگ اپنی زندگی کی کشتیاں رسل (Russel) کے الفاظ میں تمسکی تسلط (Possessive)

(happiness) کے سمندر میں کھیتے ہوں وہ لازمی طور پر بقایت، خود غرضی اور بے جانہ فک کے گرداب میں چپس جاتے ہیں۔ کیونکہ ان کی شادمانی محض بیرونی اشیاء کی غلام ہوتی ہے اور جب ان چیزوں کے لیے چھین چھپٹ کی جائے تو اس کا نتیجہ ہر لحاظ سے تباہ کن ہوتا ہے۔ جتنے والوں کے ضمیر پر چیدوں کا تسلط رہتا ہے اور ہارنے والے اپنے نزدیک زندگی کا بہترین انعام کھو بیٹھتے ہیں۔ اس کی وجہ سے قوم مختلف گروہوں میں بٹ جاتی ہے جس میں سے ہر گروہ با امتیاز ہونے کا آرزو مند ہوتا ہے کیونکہ اسی کے ذریعے وہ دنیاوی فوائد زیادہ سے زیادہ سمیٹ سکتا ہے۔ یہی وہ اصل کمزوری ہے جو موجودہ لادینی ریاست میں پائی جاتی ہے۔ نظری حیثیت سے تو جمہوری اسٹیٹ کے ہر فرد کو حاکمیت کے حقوق حاصل ہیں اور کار پر وازان حکومت ان سب کے ترجمان ہوتے ہیں مگر عملاً حکومت ایک طبقے کی خواہشات کے مطابق ہی کی جاتی ہے اور اس طرح مملکت کے باشندوں کا ایک طبقہ دوسرے طبقے کو حاکمیت سے یکسر محروم کر کے ان پر اپنی خواہشات مسلط



کہ دیتا ہے۔ اس کی سب سے بڑی کوشش یہی ہوتی ہے کہ اپنے اور اپنے ہم نوا لوگوں کے لیے زیادہ سے زیادہ فائدے حاصل کرے اور مخالفین کو جس قدر ممکن ہو نقصان پہنچایا جائے۔ دوسرے جدید میں اس کے اختیار کا دائرہ قرون وسطیٰ کے مقابلہ میں بہت زیادہ وسیع ہے۔ ملک کے سارے معاشی ذرائع اسی مختصرے طبقے کے ہاتھ میں ہوتے ہیں۔ عدالتیں، پریس اور مسلح افواج اسی کے اقتدار کی محافظ اور پاسبان ہوتی ہیں، نظام تعلیم اسی کی چاکری اور خدمت گناری کے لیے لوگوں کے ذہنوں کو ڈھالتا ہے۔ ان حالات میں اگر ملک کے مظلوم طبقے ظلم کے تسلط کے خلاف آواز بلند کر کے اپنے حالات میں کوئی خوشگوار تبدیلی لانا چاہیں تو وہ سارے راستے مسدود پاتے ہیں۔ عدالتوں کے دروازے ان کے لیے بند ہیں، ملک کے قانون میں اس قسم کی کسی تبدیلی کے لیے گنجائش نہیں ہوتی، پریس اور شرواشاعت کے تمام ذرائع ان کے اختیار سے باہر ہوتے ہیں اور اگر وہ دادرسی کے سارے آئینی راستوں کو بند پا کر غیر آئینی راستوں کو اختیار کرنے پر مجبور کر دیے جائیں تو یہ نام نہاد جمہوریت بدترین ملکیت سے زیادہ سفاک بن جاتی ہے جس نظام میں قوت اقتدار کا اصل دار ذرائع پیداوار کے قبضے پر ہو وہاں سماج کا مختلف گروہوں میں تقسیم ہو جانا بالکل ایک فطری امر ہے۔ اس میں جو گروہ طاقتور ہوتا ہے وہ بڑی آسانی سے دوسروں کے حقوق کو پامال کرتا ہے۔ جمہوریت کے ایک بہت بڑے نقاد نے اس نظام کا ذکر کرتے ہوئے بالکل درست کہا ہے :-

”یہ (جمہوریت) ایک بہت بڑا دھوکہ ہے۔ امر کے لیے تو واقعی یہ ایک جنت ہے مگر

کمزوروں اور ناداروں کے لیے یہ غلامی کا جال ہے“

سرمایہ دارانہ جمہوریت کا مقصد و حید یہ ہے کہ اقتدار کی باگیں عوام کے منتخب نمائندوں کے ہاتھ میں سے دی جائیں مگر یہ عوام جن کو اتنا بڑا اور اہم کام سپرد ہوتا ہے ان کا حال یہ ہے کہ غربت ان کے اندر غور و فکر کی ساری صلاحیتوں کو مفلوج کر دیتی ہے۔ ان میں اتنی بصیرت نہیں رہتی کہ وہ اپنے نفع و نقصان کا صحیح طور پر فیصلہ کر سکیں جس کا نتیجہ یہ ہے کہ وہ جانوروں کی طرح اپنے الگ الگ گروہ بنا لیتے ہیں اور پھر بغیر سوچے سمجھے اپنے دھڑے کے با اختیار لوگوں کی حمایت کرنا اپنی زندگی کا کمال سمجھتے ہیں۔

ان کی اپنی کوئی رائے نہیں ہوتی بلکہ ان کی آواز ان کے گروہ کی صدائے بازگشت ہوتی ہے۔  
 پروفیسر ہیرلڈ لاسکی (Harold Laski) اپنی کتاب "جمہوریت کا بحران" (Crisis of Democracy) میں لکھتا ہے:-

دوائے عامہ کا سرچشمہ نہ تو علم ہے اور نہ عقل و فہم، بلکہ اسے ہمیشہ اپنے اپنے گروہ کے مفادات  
 جنم دیتے ہیں۔ اسی لیے انتخابات میں فیصلے ایسے عجیب و غریب وجوہ کی بنا پر کیے جاتے ہیں  
 جن کا کسی طرح بھی علمی تجزیہ (Scientific Analysis) نہیں کیا جاسکتا۔

اگر ہم مختلف ممالک کے انتخابات (elections) کا ایک سرسری سا جائزہ لیں تو یہ بات  
 نہایت آسانی سے سمجھ میں آسکتی ہے کہ لوگ بالعموم کسی کو اپنے اگے لگانے وقت اس کے اخلاقی اور ذہنی  
 اوصاف نہیں دیکھتے۔ وہ صرف یہ دیکھتے ہیں کہ وہ نعرہ کتنے زور کا لگاتا ہے، اور زبان کے استعمال میں کس  
 قدر مطلق العنان ہے۔ وہ اپنی لوگوں پر فریفتہ ہوتے ہیں جو ان کا منہ حقائق سے موڑ کر انہیں آرزوؤں اور  
 تمناؤں کے پیچھے لے چلے۔ وہ عقل کی بات تباہ کرنے والوں کو اپنا دشمن اور خوش کن باتیں تباہ کرنے والوں کو  
 اپنا شفیق سمجھتے ہیں۔ وہ اسی شخص کے قدر دان ہوتے ہیں جو زیادہ سے زیادہ "خوشنما ہوائی کوسے ان کے  
 سامنے پیش کرے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اپنے نمائندوں کے انتخاب میں سپہم غلطیاں کرتے ہیں مگر نصیحت نہیں  
 پکڑتے۔ وہ اندھی پیروی کے اتنے خوگر ہو جاتے ہیں کہ کوئی خوفناک سے خوفناک سیاسی حادثہ بھی ان کی  
 آنکھیں نہیں کھول سکتا۔ پھر ان چالاک اور حیار موقع بازوں (Opportunists) کو منتخب  
 کر لینے کے بعد وہ یہ نہیں سوچتے کہ انہیں ان کے رہبر کو حرا لے جا رہے ہیں۔ کارلائل (Carlyle) کے  
 ذہن میں غالباً جمہوریت کی یہی کمزوری تھی جب اس نے کہا:

"جمہوریت ایک ایسا نظام ہے جس میں اعلیٰ اور نیک خصلت مگر خاموش انسانوں کے لیے

کوئی جگہ نہیں۔ یہاں اقتدار لاف زنون اور جھوٹوں کے حصے میں آتا ہے۔"

بلیک (Blackie) نے متعدد مثالوں سے اسی حقیقت کو ثابت کیا ہے کہ عوام بالعموم یا تو  
 فتنہ انگیز خطیبوں کے بھروسوں میں آجاتے ہیں یا کسی خوشامدی کی چکنی چٹری باتیں انہیں موہ لیتی ہیں۔ یا

سیاسی راہنماؤں کی ظاہری شان و شوکت اُن کی نظروں کو مفتوح کر لیتی ہے پھر یہ لوگ اپنے اندر اتنی اطمینان اور قوت نہیں پاتے کہ وہ اپنے میں سے کسی بہتر آدمی کا انتخاب کریں۔ اس لیے وہ ملک کی عتبات اقتدار نااہل لوگوں کو سونپ دیتے ہیں۔

اس کے علاوہ اس دور میں حکومت کی انتظامی مشینری اس قدر پیچیدہ ہو گئی ہے کہ ایک عام انسان اُسے سمجھنے کی صلاحیت نہیں رکھتا۔ صنعتی اداروں کے قوانین، بینک کاری (Banking) کے اصول اور ٹیکس (Mintage) کے مختلف طریقے اتنے مشکل مسائل ہیں کہ ہر کس و ناکس اُن کو جاننے سے قاصر ہے۔ ان کو وہی لوگ جان سکتے ہیں جو ان شعبوں میں خاص طور پر مہارت رکھتے ہوں۔ یہ مہارت اعلیٰ تعلیم کے حاصل کرنے اور وسیع تجربہ کے بعد ہی پیدا ہوتی ہے۔ مگر دور جدید میں تعلیمی مصروفیت اس قدر زیادہ ہے کہ دو تہندوں کے علاوہ کوئی دوسرا ان کے بار کا متحمل نہیں ہو سکتا۔ اس لیے غریب تعلیم سے محروم رہتے ہیں۔ سرمایہ دار طبقے کی زندگی کا راز بھی لوگوں کی جہالت میں پنہاں ہے۔ اگر دراندہ طبقوں کے ذہنوں میں فکر و احساس کی لہریں پیدا ہو جائیں تو وہ امیروں کے لیے خطرہ کا آلام ہے۔ اس لیے حکمران طبقوں کی سادی کوششیں اس بات پر مرکوز رہتی ہیں کہ وہ لوگوں کو زیادہ سے زیادہ جاہل رکھیں یا انہیں ایسی تعلیم دیں جو اُن کے اندر غور و فکر کی صلاحیتوں کو ابھارتے کی بجائے اُن کے ذہنی قوی کو کبیر معطل کر دیں۔ ہیرلڈ لاسکی لکھتا ہے :-

”اگر علم کی کلید غربا کے ہاتھ میں دے دی جائے تو وہ اس بات کو سوچنے پر مجبور ہو جائیں گے کہ اس نظام کو ریخ و بن سے اٹھا ڈیا جائے جو بغیر کسی منصفانہ اصول کے سماج میں عدم مساوات کو روارکھتا ہے۔ اس لیے تمام وہ حکومتیں جو عدم مساوات (inequality) کی سلس پر قائم ہیں وہ اپنی قوت لوگوں کی جہالت سے حاصل کرتی ہیں۔ اور اس لیے ملک میں ایسا نظام تعلیم رائج کرتی ہیں جو اس غلط اساس کو کم سے کم صدمہ پہنچائے۔ لہذا تعلیم کا مقصد لوگوں کو علم سے بہرہ ور کرنا نہیں بلکہ سرمایہ داری کو ہر قسم کے حملوں سے محفوظ کرنا ہے“



قریب قریب یہی حال پریس کی آزادی کا ہے۔ جمہوریت کے حامیوں کو پریس کی آزادی پر بڑا ناز ہے مگر اس سے بڑا فریب اور کوئی نہیں ہو سکتا۔ ہر شخص اس بات سے بخوبی واقف ہے کہ اخبار کا اجرا اور اس کا چلانا ایک نرہ کثیر کے بغیر ممکن نہیں۔ اس لیے اس کا دوبارہ کو صرف امیر لوگ ہی جاری کر سکتے ہیں۔ ان کے پیش نظر اس کے سوا کوئی مقصد نہیں ہوتا کہ وہ ہر ممکن ذریعے سے زیادہ سے زیادہ دولت کمائیں اور اپنے مستقل مفادات (vested interests) کی پاسبانی کریں۔ اس کام کے لیے ہر ذیل سے ذیل حربہ استعمال کیا جاتا ہے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ پریس عوام کی راہنمائی کرنے کی بجائے ایک جھوٹا اگلنے والا چشمہ بن جاتا ہے۔ خبروں کو اس طرح ترتیب دیا جاتا ہے کہ اس سے ایک طبقے کے گنے چنے افراد کو فائدہ پہنچے۔ اس طریق سے قوم کی قوم کو چند افراد حالات کا ایک خاص رنگ کی عینک سے مطالعہ کرتے ہیں، اس کو ایک خاص زاویہ نظر دیتے ہیں اور اس طرح آزادی فکر بالکل ختم ہو جاتی ہے۔ پریس مفاتیح کو نمایاں کرنے کی بجائے انہیں اس طرح پیش کرتا ہے کہ حقیقت جھوٹ کی بشمار تہوں کے نیچے دب کر آنکھوں سے کیسے اور جھل ہو جاتی ہے۔ خاص طور پر انتخابات کے زمانے میں پریس ذہنی فضا کو اتنا متلاطم کر دیتا ہے کہ انسان کے لیے سکون و اطمینان کے ساتھ حالات کو سمجھنا مشکل ہی نہیں بلکہ قریب قریب محال ہو جاتا ہے۔ ان حالات میں لوگ ہوش سے زیادہ جوش سے کام لیتے ہیں اور جب ان کے فکر کے جہاز بے لنگر ہو جاتے ہیں تو پروپگنڈا کی تند و تیز ہوا میں ان کو جدھر چاہتی ہیں وہکیل دیتی ہیں۔

اس کے ساتھ ملک کا حکمران طبقہ پریس کو اپنے قبضے میں رکھنے کے لیے بعض پابندیاں براہ راست ان پر عائد کرتا ہے۔ خبروں پر سنسر (Censor) کے پرے بٹھا دیے جاتے ہیں تاکہ وہ وہ خزانہ جو ظلم و ستم ہوتا ہے اس کی کسی کو خبر نہ ہو۔ پریس ایکٹ ایسے مذموم قوانین کو حرکت میں لا کر بوقت ضرورت نہایت آسانی سے مخالف آواز کا گلا گھونٹ دیا جاتا ہے۔ پھر اخلاقی اور قومی اور ملی مفاد کا بہانہ لے کر جب جی چاہے کسی مخالف آواز کو بڑی آسانی سے دیا جاسکتا ہے۔ یہ ہے پریس کی آزادی کی اصل حقیقت۔

جمہوریت کا جوہر آزادی انتخاب اور آزادی رائے دہی کا متقاضی ہے اور اس نظام کے علمبردار اس کے بڑے گن گاتے ہیں، اسے انسانیت کا معراج اور عوام کی فتح خیال کیا جاتا ہے مگر حقیقت یہ ہے کہ اس آسمان کے نیچے شاید ہی کوئی جھوٹ اُتتا ہوا ہو۔ ملک کے سربراہ دار ہر قوم کی چالوں کو استعمال میں لاکر لوگوں کو حکومت کے انتظام و انصرام میں حصہ لینے سے روک دیتے ہیں۔ رائے دہی پر پیشکار ایسی پابندیاں عائد کی جاتی ہیں جن سے کسی مخالف کا منتخب ہو جانا مشکل ہی نہیں بلکہ قریب قریب ناممکن ہوتا ہے۔ چنانچہ امریکہ ایسے قبلہ جمہوریت کا یہ حال ہے کہ وہاں کے سیاہ فام باشندوں کو کاغذ پر ویسا ہی حق رائے دہی حاصل ہے جیسا کہ سفید فام لوگوں کو، مگر عمل کی دنیا میں حبشی اس حق سے بالکل محروم ہیں۔ اس بات کا فیصلہ صرف اس ایک چیز سے ہو سکتا ہے کہ پچھلے پچاس سال کے عرصے میں صرف ایک حبشی کانگریس کا ممبر ہو سکا۔ انتخاب کے وقت ان سیاہ فام لوگوں کو رائے دہی کی اہمیت ثابت کرنے کے لیے بڑی بڑی آزمائشوں سے گزرنا پڑتا ہے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ ووٹ دینے سے پہلے ہی ایک بھاری اکثریت اس حق سے محروم ہو جاتی ہے۔

ایک کتاب جس کا نام ہے ”جمہوریت کا گھر سے آغاز ہوتا ہے“ ( Democracy begins

at Home ) اس میں اس کے مصنف جینگ پیری ( Jennings Perry )

نے آئندہ انتخاب کے دعوے کو ناقابل تردید دلائل سے باطل ثابت کیا ہے۔ اس نے بتایا ہے کہ کس طرح ۱۸۸۹ء سے ۱۹۰۸ء تک ایک ٹیکس برابر اس مقصد کے لیے لگایا جاتا رہا تاکہ لوگوں کو ووٹ دینے سے روک دیا جائے۔ اس کا جو اثر ہوا وہ جمہوری نظام کے نام پر ایک بدناما و حید ہے۔ ۱۹۳۶ء میں ریاست ٹینسی ( Tennessee ) کے گورنر کا جب انتخاب ہوا تو بارہ لاکھ ووٹر مل میں سے صرف تین لاکھ باون ہزار ووٹ دے سکے۔

پھر بات یہیں پر ختم نہیں ہوتی بلکہ ووٹوں کے باقاعدہ سوسے ہوتے ہیں اور انتخاب کی منڈی کے بعض مہول سیل ڈیلر بہت بڑے پیمانے پر یہ کاروبار کرتے ہیں۔ ریاست میس سی کے جس انتخاب کا اوپر ذکر کیا

گیا ہے اس میں ایک شخص ایڈوکیٹ کیل کر مپ کے متعلق یونائٹڈ پریس کے نمائندے کا بیان یہ ہے کہ تنہا اس شخص کے قبضے میں ساٹھ ستر ہزار ووٹ تھے اور اس طرح ریاست کی قسمت کا فیصلہ کرنے میں اس کی ذات کو بہت بڑا دخل تھا۔ یہ شخص ٹیلیفون پر بیٹھا ووٹوں کے سووے کیا کرتا۔

اسی طرح ایک دوسرا مصنف ریزے میوزا Ramsay Muir، اپنی کتاب "انگلستان کی حکومت کس طرح چلائی جاتی ہے" How England is Governed میں برطانوی نظام

انتخاب کو انتہائی غیر منصفانہ، غیر اطمینان بخش اور خطرناک سمجھتا ہے۔ اس کا تجزیہ وہ یوں کرتا ہے:-

"اگر ووٹوں کے استعمال کی حقیقت کو دیکھا جائے کہ کتنے ووٹ اس لیے ڈالے نہیں جاتے

کہ بہت سے ووٹروں کی پسند کے مطابق صحیح معیاری امیدوار موجود نہیں ہوتا، کتنے ووٹ ایک

معیاری امیدوار کے سامنے نہ ہونے کی وجہ سے بڑی بلا کے مقابلے میں چھوٹی بلا کے اصول پر نااہل

لوگوں کو دے دیئے جاتے ہیں اور کتنے ووٹ ناکام امیدواروں کو دے جانے کی وجہ سے

بجاظنیجہ ضائع ہو جاتے ہیں تو معلوم ہو گا کہ ملک کا سامان نظام صرف ملک کی ایک تہائی سے کم

آبادی پر چلتا ہے۔"

اس پر مستزاد یہ کہ ووٹروں کو رشوت دینے کا رواج ملک میں صحیح رائے عامہ کو ابھرتے نہیں دیتا۔ لوگوں

کو اس بات کا اچھی طرح احساس ہوتا ہے کہ ان کے ووٹوں کی مدد سے ہی اقتدار کے بھوکے حکومت کے

ایوانوں میں داخل ہو سکتے ہیں۔ اس لیے انہیں بہر حال ان کو خریدنا ہے۔ ووٹر اپنے ووٹ یا دوسرے

الفاظ میں اپنے ضمیر کی آواز کا زیادہ سے زیادہ قیمت پر سودا کرتے ہیں۔ دوسری طرف ووٹ لینے والے

بھی اس کی اہمیت کو اچھی طرح جانتے ہیں، انہیں علم ہے کہ یہی وہ سم سم ہے جس سے اس راہ کی ساری

منزلیں آسانی سے طے ہو جاتی ہیں اور کمرانی اور غیر وز مند کی گئے طلسمی دروازے خود بخود کھل جاتے ہیں

لہذا وہ اس کو بہر تابیاب کو ہر قیمت پر حاصل کرنے کی سعی کرتے ہیں۔ کیونکہ انہیں اس راز کا پتہ ہوتا ہے کہ

لے یہ واقعات جناب نعیم صدیقی صاحب کی ایک تقریر سے جو انہوں نے ایک کتاب Soviet Democracy

and Bourgeois Democracy سے اخذ کیے ہیں، لیے گئے ہیں۔



برسر اقتدار آنے کے بعد اس کا روبرو پر لگا ہوا سرمایہ چند دنوں میں ہی کٹی گنا ہو جاتا ہے۔ یہی وہ وجہ ہے جس کی بنا پر ہر قسم کی قانونی پابندیوں کے باوجود وٹوں کی نیلامی ہوتی ہے۔ چنانچہ ”امریکہ راز میں“ ( U. S. A. Confidential ) کے مصنفین جیک لیٹ ( Jack Lait ) اور لی مارٹی مر ( Lee Mortimer ) نے اس حقیقت کا نہایت ہی جرأت مندی سے اعتراف کیا ہے کہ ”امریکہ کے عیار سیاستدان سیاہ فام لوگوں کے ووٹ حنفیہ پولیس کے دباؤ سے، منزائے موٹ کے قانون کی تفسیح کے لالچ سے، اور اسی قسم کے دیگر آئینی اقدام کے فریب سے ہتھیار لیتے ہیں۔“

ووٹ صرف زر اور عہدوں کے لالچ سے ہی نہیں بلکہ دوسرے کئی ایک مکروہ طریقوں سے حاصل کیے جاتے ہیں۔ اس معاملے میں کسی اخلاقی اصول کی پابندی نہیں کی جاتی۔ اگر ضرورت پیش آجائے تو اقتدار کے سروے حسن کی قیمت پر بھی نہایت بے تکلفی سے چکائے جاسکتے ہیں۔ ان حقائق پر غور کرنے سے ہر صاحب فکر اس حقیقت کو جان سکتا ہے کہ موجودہ طریق انتخاب اچھے اور قابل آدمیوں کو برسر اقتدار لانے میں سخت ناکام ثابت ہوا ہے۔ قدر جدید کے انتخابات جاہ شہمت کے پرستاروں کے لیے ایک میدان ہے جس میں وہ اپنی چالاکیوں اور عیاریوں کے پورے کرتب دکھاسکتے ہیں۔ جیک لیٹ ( Jack Lait ) لکھتا ہے:-

”تاریخ نے بار بار اس حقیقت کو ثابت کیا ہے کہ اقتدار کے بھوکے افراد نہایت ہی خوفناک و زندقے ثابت ہوئے ہیں۔ اقتدار ایک قسم کا ڈائنامائٹ ( Dynamite ) ہے جو نکلے ہاتھ آجاتا اور

لے antilynch بل کے لیے اردو میں کوئی موزوں لفظ نہ ملنے کی وجہ سے اس کے مفہوم کو اس طرح ادا کیا گیا ہے۔ امریکہ میں لٹش کرنا Lynching انصاف کا ایک نرالا طریقہ ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ عوام جب عدالت کے فیصلے پر مطمئن نہ ہوں یا قانون کی سست تقاضا شہری کو آہستہ چلتے دیکھ کر صبر نہ کر سکیں تو قانون کو ختم کرنے کے لیے اس شخص کو وہ مجرم سمجھتے ہوں اسے اپنے نزدیک جو نقصانہ منزا چاہیں دیں۔ اس طریق انصاف کا دار عموماً حبشیوں پر ہی ہوتا ہے۔

اس سے وہ لوگوں کو تباہ و برباد کرتے ہیں۔“

لوگوں کی بد نصیبی انتخابات کے ختم ہو جانے کے بعد ختم نہیں ہوتی بلکہ اس کے اختتام پر ظلم و ستم کا آغا ہوتا ہے۔ قوت حاصل ہو جانے کے بعد اقتدار کے بھکاری ان سب وعدوں کو فراموش کر دیتے ہیں جن کے دام میں چھٹا کر انہوں نے لوگوں سے ووٹ حاصل کیے تھے۔ جو لوگ ان کے اقتدار کی رکشا کو کھینچ کر حکومت کے ایوانوں تک لے جاتے ہیں انہی پر طرح طرح کے مظالم ڈھائے جاتے ہیں۔ ان کی حدیں مختلف حیلوں اور بہانوں سے تراشی جاتی ہیں تاکہ ان کی تجوریاں بھریں۔ لہذا اگر یہ کہا جائے کہ آزادی انتخاب ایک زبردست دھوکہ ہے تو اس میں قدرہ بھر مبالغہ نہ ہوگا۔ یہ آزادی صرف ان چند خوش نصیبوں کے لیے ہے جن کے پاس دولت ہے۔ یہ اتنے زبردست شواہد ہیں کہ کوئی صاحب بصیرت اور صاحب ضمیر ان کا انکار نہیں کر سکتا۔ برطانیہ کے ایک مشہور وزیر سر سٹیفورڈ کریسپن نے اس حقیقت کو تسلیم کرتے ہوئے کہا :-

”انتخاب کے مروجہ طریقوں میں بے شمار نقائص ہیں اور یہ نقائص نتیجہ ہیں اس برتری کا جو کہ

اصحاب ثروت کو غربا کے مقابلے میں نصیب ہوتی ہے۔“

تہذیب الحاد کی یہ دختر نیک اختر اپنے مزاج کے اعتبار سے اتنی ضدی اور حمل کے لحاظ سے اس قدر سست واقع ہوئی ہے کہ آہ کو چاہیے اک عمر اثر ہونے تک اس کے جان نثاروں میں اول تو کوئی نیک اور شریف انسان اگلی صفوں میں آہی نہیں سکتا اور اگر وہ بیچارہ کسی طرح آ بھی جائے تو وہ خود کوئی فیصلہ نہیں کر سکتا بلکہ وہ اپنے تئیں خارجی قوتوں کا بازیچہ تصور کرتا ہے۔ نہانے کی آندھیاں اسے کبھی ایک طرف اڑا لے جاتی ہیں اور کبھی دوسری طرف۔ اسے اتنی آزادی نہیں ہوتی کہ وہ اپنے اخلاقی معیار اور اپنے فکر و نظر کے ایتقان سے حالات اور واقعات کو جانچ سکے۔ وہ ہمیشہ دوسروں کی راستے کا پابند ہوتا ہے۔ سیاست کے اس پورے نامگ میں اس کی ساری دلچسپیاں صرف اسی قدر ہیں کہ اس کی اپنی ذات کو کسی طرح کا کوئی نقصان نہ پہنچنے پائے۔ جب حالات یہ ہوں تو کسی جرأت مندانہ اور موثر

قدم کا اٹھانا محال ہے۔ اگر چند سر پھرتے اس طرف متوجہ بھی ہوں تو سوائے ناکامی کے انہیں کچھ نصیب نہیں ہو سکتا۔ وہ لوگ جن میں نہ تو کوئی باطنی ہم آہنگی ہو اور نہ اشتراک احساس، ان سے یہ توقع نہیں کی جا سکتی کہ وہ عمل کے متوجہ ہیں کوئی متحد کرنے والا حقیقت کا نقطہ پائیں گے۔ اور جب تک اس نقطے کو تلاش نہیں کر لیا جاتا کسی اساسی تبدیلی کا لے آنا جوئے شیر لانے کے مترادف ہے۔

بنیادی تبدیلیوں کا تو ذکر ہی کیا کسی قانون میں معمولی ترمیم بھی بڑا صبر آزما کام ہے۔ اس راستہ کا پہلا قدم یہ ہے کہ متضاد طاقتوں کی منظم مخالفت کے علی الرغم رائے عامہ کو اس کے لیے تیار کیا جائے پھر لوگ اس کے لیے ایک مسلسل اور پیہم جدوجہد کریں تب کہیں ممکن ہے کہ یہ مطالبہ خداوندان مملکت سے شرف قبولیت حاصل کرے، مگر اس شرط کے ساتھ کہ اس میں ان کے مفادات کو کوئی آٹھ نہ لٹے۔ اگر بالفرض رائے عامہ کے شدید دباؤ کے تحت یہ لوگ اس کو ماننے پر مجبور بھی ہو جائیں تو پھر اس میں اس قدر تصرف کر لیا جاتا ہے کہ ترمیم بالکل بے سود ہو جاتی ہے۔ جمہوری ممالک کی تاریخ اس قسم کی مثالوں سے بھری پڑی ہے۔ ہم یہاں انگلستان کے صرف ایک قانون کی تیغ کا تذکرہ ہیں۔ اس سے آپ کو اندازہ ہو جائے گا کہ قانون کے دائرے میں رہتے ہوئے بھی کسی ضروری ترمیم کو پاس کر لینا کس قدر جان جو کھوں کا کام ہے۔

۱۰ اہل انگلستان نے پولیس کے ساتھ جنگ کے خاتمے پر غلطی کی وہ آمد بند کر دی اس

کا مقصد زمینداروں اور جاگیرداروں کو فائدہ پہنچانا تھا، مگر اس کے ساتھ ہی غریبوں پر ایک قیامت ٹوٹ پڑی۔ وہ اس ہر شے ربا گرانی کی تاب نہ لا کر مجبور ہو گئے کہ اس قسم کے ظالمانہ اور غیر منصفانہ قانون کی تیغ کا مطالبہ کریں۔ چنانچہ انہوں نے اس کو حکومت کے سامنے پیش کیا۔ مگر چونکہ ملک میں غلبہ اقتدار کا مقام جاگیرداروں اور بڑے بڑے زمینداروں کو حاصل تھا اور پارلیمنٹ پر بھی وہی چھلٹے ہوئے تھے، اس لیے عوام کی چیخ پکار کے باوجود حکومت کی بارگاہ میں ان کی کوئی شنوائی نہ ہو سکی۔ بلکہ اس کے برعکس ان "شر پسندوں" کو دبانے کے لیے مختلف قوانین وضع کیے گئے۔ اس تحریک کے سربراہ کاروں پر مقدمے چلائے گئے، عیسائی کارپس ایکٹ



( Habeas Corpus Act ) معطل کر دیا گیا۔ اس سے حکومت کے کارندوں

کو یہ اختیار مل گیا کہ وہ جتنی مدت چاہیں کسی کو قید و بند میں رکھیں۔ اس کے علاوہ چھ اور قوانین پاس کیے گئے جن کی رو سے پینسلٹوں پر ایک بھاری ڈیوٹی عائد کی گئی اور یہ طے پایا کہ کوئی جیلر بغیر صدر بلدیہ کی اجازت کے منعقد نہیں کیا جاسکتا۔ مظلوم عوام کئی سال تک ان قوانین کو بدلنے کی ناکام کوشش کرتے رہے۔ پیل ( Peel ) جو اس وقت وزیر اعظم تھا وہ بھی باوجود پردی سٹی کے اس میں ناکام ہوا۔ کیونکہ وہ معاد پرست اکثریت کی حمایت نہ حاصل کر سکا۔ بالآخر مدت و دما کی جدوجہد کے بعد یہ قوانین منسوخ کیے گئے۔

اسی طرح ایک ایک فیکٹری ایکٹ ( Factory Act ) پاس کروانے کے لیے مزدوروں کو پیشکار قربانیاں دینی پڑیں۔ دودھ کیوں جالیٹے اپنے ملک میں ہی ہم دیکھتے ہیں کہ معمولی معمولی باتوں کے لیے کتنی چیخ پکار کر نا پڑتی ہے اور اس کے باوجود کوئی کامیابی نہیں ہوتی۔ سرمایہ دارانہ جمہوریت کا ایک اور دعویٰ یہ ہے کہ اس میں فرد کو آزادی حاصل ہے مگر یہ دعویٰ بھی اتنا ہی باطل ہے جتنے کہ دوسرے دعویٰ۔ آزادی رائے اسی وقت تک قابل برداشت ہے جب تک کہ یہ حکمراں طبقے کے مفاد کے لیے نقصان دہ ثابت نہ ہو، مگر جوہی یہ اس پر اثر انداز ہونا شروع ہوتی ہے اسی وقت اس کی حدود ختم ہو جاتی ہیں۔ امریکہ جو جمہوریت کا سب سے بڑا دعویدار ہے وہاں ۱۹۲۶ء میں ایک کمیٹی کی تشکیل کی گئی جس کا مقصد امریکہ دشمن عناصر ( Un-American element ) سے ملک کو پاک کرنا تھا۔ نیویارک ٹائمز نے اس کمیٹی کی کارگزاریوں کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے :-

سول سروس کمیشن کی جگہ اب ایک وفاقی محکمہ تفتیش ( Federal Bureau

of investigation ) قائم کیا گیا ہے۔ یہ اقدام نہایت ہی خطرناک ہے۔ اس

سے ریاستہائے متحدہ امریکہ ( United States ) پولیس اسٹیٹ میں تبدیل ہو جائیگی

اس لیے یہ کاروائی بالکل تخریبی ہے۔

اسی طرح ۱۹۳۷ء میں صدر ٹرومین نے ایک حکم نامہ جاری کیا جس پر بغیر کسی ادنیٰ تاثر کے عملدرآمد شروع ہو گیا۔ اس کی نوسے تمام ملازمین کی تفتیش کی گئی اور تمام تخریب پسند عناصر کو چھانٹ چھانٹ کر الگ کر دیا گیا۔ اعداد و شمار سے پتہ چلتا ہے کہ تمام وہ اشخاص جو اس آزمائش سے گزے ان کی مجموعی تعداد ۲۳۰۰۰۰ تھی۔ جس شخص کے متعلق "وطن دشمنی" کا معمولی شبہ بھی ہوا اُسے نہ صرف یہ کہ وسائل رزق سے محروم کر دیا گیا بلکہ اُسے قید و بند کی صعوبتیں بھی برداشت کرنا پڑیں۔

ان تصریحات کے بعد یہ بات سمجھ میں آ سکتی ہے کہ جمہوری نظاموں میں کوئی اساسی تبدیلی تو کیا کوئی معمولی سے معمولی تبدیلی کا لانا بھی بڑا ہی مشکل کام ہے۔

جمہوریت کے بعض پیاروں کو کبھی کبھی یہ کہتے بھی سنا گیا ہے کہ چلئے یہ ساری باتیں کسی تک دست ہی سہی مگر اس نظام میں اتنی گنجائش تو موجود ہے کہ مظلوم جب چاہیں مملکت کی "آزاد عدالتوں" کی طرف رجوع کر کے انصاف حاصل کر سکتے ہیں۔ ان کی مدد سے ظالموں کو سزا دی جاتی ہے اور مستحقین کو ان کے حقوق لوٹائے جاتے ہیں۔ ہم نہیں کہہ سکتے کہ جو لوگ نظام سرمایہ داری میں عدالتوں سے اس قسم کی توقعات وابستہ کرتے ہیں کیا وہ فریب نفس میں مبتلا ہیں یا قریب نظر کا تمکار ہیں؟ لیکن اتنی بات ہر معمولی سے معمولی انسان بھی جانتا ہے کہ جب "مناصب کے چاہنے والے" یہ عہدے ایک مخصوص طبقے کے "فیضانِ کرم" سے حاصل کرتے ہوں تو پھر عدالت کی کرسیوں پر براجمان ہونے کے بعد وہ اپنے "آقا والی نعمت" کو کس طرح بھول سکتے ہیں۔ خاص طور پر ان حالات میں جبکہ انہیں اس بات کا پوری طرح علم ہو کہ ان کا ان عہدوں پر فائز رہنا اور ترقی کرنا انہی کی ذات گرامی سے وابستہ ہے۔ مگر بالفرض سو میں سے بلکہ ہزار میں سے ایک آدھ "سر پھرا" اپنے ضمیر اور ایمان کے

لہ "تخریب پسندی اور وطن دشمنی" دو ترقی پسندانہ اصطلاحیں ہیں جو تہذیبِ الحاد کے کارخانہ تکفیر سے ابھی ابھی ڈھل کر آئی ہیں۔ ان کا مفہوم اتنا وسیع ہے کہ اقتدار کے ہر مخالف پر انہیں آسانی سے چپکایا جاسکتا ہے۔ تہذیبِ جدید کے مشائخ "صرف ان کو موقع اور محل کے مطابق اچھی طرح استعمال کرتے ہیں بلکہ ان سے پورا پورا فائدہ بھی اٹھاتے ہیں۔

تقاضوں سے مجبور ہو کر حکمران طبقے کے خلاف کوئی فیصلہ دینے کی جسارت بھی کرتا ہے تو قانون کے بندھن اس کا ہاتھ روک لیتے ہیں۔ ملک کا مروجہ قانون اس بنیاد پر موقوف کیا جاتا ہے کہ ملک کے اہل وقت پر لحاظ سے محفوظ رہیں۔ ہیرلڈ لاسکی اپنی کتاب "جمہوریت کا بحران" میں اس حقیقت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھتا ہے :-

• ملک کا دستور ابدی اور غیر متغیر قوانین پر مشتمل نہیں ہوتا بلکہ یہ نام ہے چند ایسے ضوابط کا جن کو وقتاً فوقتاً وقتی مصالح کے پیش نظر بدل دیا جائے۔ قانون کا تانا بانا تیار کرنے وقت چند ہی مقاصد سامنے ہوتے ہیں۔ مجبوں کے ہاتھ میں یہ اختیارات نہیں ہوتے کہ وہ خود قوانین وضع کریں اور پھر ان کے مطابق فیصلے دیں۔ ان کا فرض صرف یہی ہے کہ وہ رائج الوقت قانون کو حالات پر منطبق کر کے فیصلہ صادر کریں۔ حج بیچارے ایسا کرنے پر مجبور ہیں۔ وہ ہر بعد اپنی آنکھوں سے ظلم ہوتا دیکھتے ہیں مگر آفت تک نہیں کر سکتے۔ ان کے قلم ہر صبح اور ہر شام ان کی بے بسی اور مجبوری کی چغلی کھاتے ہیں۔ وہ با اختیار ہونے کے باوجود بے اختیار ہوتے ہیں۔"

اس سلسلے میں اس حقیقت کو بھی فراموش کر دیا جانا ہے کہ حج بالعموم ملک کے بااثر طبقے سے لیے جاتے ہیں۔ ایک خاص ماحول میں ان کی پرورش ہوتی ہے، اس وجہ سے ان کی ذہنی ساخت کچھ اس قسم کی ہو جاتی ہے کہ فیصلے دیتے وقت وہ شعوری یا غیر شعوری طور پر اپنے ہی طبقے کے لوگوں کا پاس رکھتے ہیں۔ "فرطاس" پر لکھا ہوا قانون بیشک امیر اور غریب کے درمیان کوئی تفریق نہیں کرتا مگر عمل کے اعتبار سے ان دونوں میں عظیم فرق ہے۔ اگر کسی کو اس کا اندازہ کرنا مقصود ہو تو وہ عدالتوں میں جا کر اپنی آنکھوں سے دیکھ لے کہ ایک قسم کے مجرموں میں محض دنیاوی مراتب کے تفاوت کی وجہ سے قانون کے اندر کتنی لچک پیدا ہو جاتی ہے۔

H. Laski : The Crisis of Democracy p. 129

۱۷

۱۸ پچھلے دنوں لاہور ہائی کورٹ کے چیف جسٹس مسٹر منیر نے گجرات کے ایک قتل کے مقدمے میں اسی قسم کے خیالات کا اظہار فرمایا تھا۔



ججوں کے فیصلوں پر صرف اُن کے ذاتی میلانات ہی اثر انداز نہیں ہوتے بلکہ بسا اوقات دولت کا لالچ اُن کو راہِ حق سے پھیر دیتا ہے۔ ایک ایسا سماج جس میں دنیاوی جاہ و جلال اور مادی فوائد و لذائذ زندگی کا سب سے قیمتی سرمایہ سمجھے جاتے ہوں وہاں ہر فرد کے دل میں اُن کے حاصل کرنے کی خواہش کا موجزن ہونا ایک قدرتی بات ہے۔ سچ اس سے مستثنیٰ نہیں۔ اس لیے وہ محض حقیر فائدوں کے لیے کئی بے گناہ لوگوں کو اُن کے جائز حقوق سے محروم کر دیتے ہیں۔ ڈسکونٹ برائٹس (Viscount Bryce) اپنی شہرہ آفاق کتاب 'جدید جمہوریتیں' (Modern Democracies) میں لکھتا ہے :-

”بد اخلاقی کے سارے مظاہر میں سے عدلیہ کی بددیانتی سب سے زیادہ نفرت انگیز ہے۔ کیونکہ یہی وہ سب سے آسان طریقہ ہے جس کی مدد سے امیر غریب کے حقوق پر ڈاک ڈالتے ہیں۔ فرانسیسیوں کو اپنی عدالتوں پر کوئی اعتماد نہیں رہا۔ امریکہ میں بعض بچوں پر ایسے جج موجود ہیں جن کے انتخاب میں یا تو سیاستدانوں کا دخل ہے یا بڑے بڑے صنعتی اداروں کا۔ بعض شہروں میں وکلاء بھی عدالتوں پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ وقت کے ساتھ ساتھ ججوں کی رائے کے بدلنے کے طریقوں میں بھی اچھی خاصی تبدیلی واقع ہوئی ہے۔ اب رشوت ستانی کے ایسے عمدہ طریقے نکل آئے ہیں جن پر کسی کو کوئی شک نہیں ہوتا۔ لوگ اب ججوں کے سامنے سونے اور چاندی کے ڈھیر نہیں لگاتے بلکہ اُن کو صرف اتنی اطلاع دینا کافی ہے کہ اگر وہ بعض مقدمات کا فیصلہ ان کی مرضی کے مطابق کر دیں تو فلاں فلاں کمپنی میں انہیں بغیر سرمایہ لگائے اتنے حصوں کا مالک بنا دیا جائے گا۔“

عدلیہ کا انتظامیہ سے آزاد ہونا بھی صرف ایک ڈھونگ ہے۔ اس دور میں جب کہ حکومتیں اپنی انتظامی مشینری کو بڑی سرعت کے ساتھ مرکزیت (Centralization) کی طرف لے جا رہی ہوں کیا یہ باور کیا جاسکتا ہے کہ کسی ملک میں عدلیہ کا شعبہ یکسر آزاد ہوگا۔ ججوں کا انتخاب

عوام کے نمایندگان کی ایک مجلس کے سپرد ہوتا ہے۔ اس لیے وہ ان کی آرا پر ہر وقت اثر انداز ہوتے رہتے ہیں۔ بے ضمیر مفاد پرست سیاستین کا یہ ٹولہ جب کسی سچ کو اپنی مرضی کے مطابق نہیں پاتا تو رائے عام کو فوراً اس کے خلاف اُبھارتا ہے، اس طرح سچ بیچارا حالات کے ہاتھوں مجبور ہو جاتا ہے کہ یا تو ان کی بات مان لے یا عدالت کی کرسی خالی کر دے۔ لہذا وہ اپنی عافیت اسی میں سمجھتا ہے کہ بڑی سرکار سے جو "اطلاع" پاسے اسی کے مطابق بلاچون و پورا فیصلہ دے دے۔ پبلک کے نمایندگان کی بے جا دخل اندازی نے جس طرح انگلستان کی انتظامی مشینری کو برباد کیا ہے اُس کا ردنا روتے ہوئے جی۔ ایس۔ بارکر ( J. Ellis Barker ) کہتا ہے :-

۱۔ انگلستان اب ایک وسیع کاروبار ہے جس کو چند نا آموذ ( اور ) جھگڑاؤ منتظمین اپنی اپنی خواہشات کے مطابق چلا رہے ہیں۔ ان کے درمیان کوئی ایسا انسان نہیں رہا جو ان پے علم اور ناتجربہ کار لوگوں کی رہنمائی کر سکے۔ ان لوگوں کو کام سے کوئی غرض نہیں، بلکہ ان کی ساری دلچسپیاں صرف اسی ایک بات پر مرکوز ہیں کہ کسی نہ کسی طرح وہ ان عہدوں پر قابض رہیں۔

۲۔ پچھلے دنوں امریکہ میں روزن برگ ( Rosenberg ) اور اُس کی رفیقہ حیات کو عدالت نے جس دباؤ کے تحت موت کا حکم سنایا وہ عدلیہ کی آزادی کے پروے کو چاک کرنے کے لیے کافی ہے۔ ان بیچاروں کو محض حکم ان طبقہ کے ایما پر ختم کیا گیا۔ جیوری کے ایک ممتاز رکن لارڈ جیویٹ ( Lord Jowitt ) نے اس حقیقت کا کھلے بندوں اعتراف کیا ہے کہ اس منزل کے ایسے شہادتیں ناکافی ہیں۔ مگر چونکہ حکم ان طبقہ ان خون سے ہاتھ رنگنے پر تلا بیٹھا تھا اس لیے کوئی تدبیر بھی کارگر نہ ہوئی حتیٰ کہ جب جیٹس ڈگلس ( Douglas ) نے دلائل کے کمزور ہونے کی وجہ سے دوبارہ مقدمہ چلانے کی اجازت دینا چاہی تو جمہوریت کے پرستاروں نے سخت وارہیل کیا اور سچ کو مواخذہ ( impeachment ) کی دھمکی بھی دی۔ مرنے والے مرگئے مگر ان کی موت سے جمہوریت کے سامنے بلند بانگ دعووں کی اصلیت دنیا پر آشکارا ہو گئی ہے۔

پھر انصاف کوئی ایسی آرزو نہیں جس کو خریدنے کی ہر کس و ناکس میں طاقت ہو۔ اقتدار کی اس منڈی ( Power market ) میں سب سے قیمتی چیز یہی عدل ہے۔ اس لیے اسے صرف ہی لوگ حاصل کر سکتے ہیں جن کی جیبیں ڈالروں سے پُر ہوں۔ اس کے ساتھ ہی "انصاف کے طلبگار" کو اتنی آزیں ہوں میں سے گزرنا پڑتا ہے کہ بڑے بڑے لوگوں کی ہمت جواب دے جاتی ہے۔ غریب اور نادار لوگ سخت سے سخت مظالم کو برداشت کر لیتے ہیں، انہیں سخت سے سخت بے انصافی گوارا ہوتی ہے مگر وہ اپنے اندر یہ طاقت نہیں رکھتے کہ عدالت کا دروازہ کھٹکھٹائیں۔

یہ ہے جمہوریت کی اصلیت۔ حقائق اگرچہ بڑے ہی تلخ ہیں مگر وہ اپنی جگہ پر موجود ہیں محض پریکٹس کا لفظ استعمال کر کے انہیں جھٹلایا نہیں جاسکتا۔ جہاں جہاں لوگ اس نظام کے اندر زندگی گزار رہے ہیں وہ اس کی تلخیوں کو اچھی طرح جانتے ہیں۔ ممکن ہے کہ ہر ملک میں حالات ایک جیسے نہ ہوں مگر فرق جو کچھ ہے وہ مزاج کا ہے نوعیت کا نہیں۔ اس وقت کے پرستار بعض واقعات کی تردید کر سکتے ہیں مگر وہ اس ظالمانہ ماحول کا انکار نہیں کر سکتے جس کو ان واقعات نے مل کر پیدا کیا ہے۔ کسی ایک واقعہ کی توجیہ کی جاسکتی ہے مگر اس ظلم کی کیا توجیہ ہو سکتی ہے جس سے لاکھوں تہیں بلکہ کروڑوں انسان آسناہیں۔ کون نہیں جانتا کہ آج بھی پیداوار اور غرور نے اُوبسیت و خدائی کی اسی صورت کو اختیار کر رکھا ہے جو غرور کا خاصہ تھا۔ آج بھی قوم و وطن اور عقائد عامہ کے نام پر انسانی خواہشات و آرزوؤں کے صنم خانے آباد ہیں۔ نام کے تبدیل کر دینے سے دکھ دور نہیں ہوتے اس کے لیے انسان کے فکر و نگاہ کے زاویوں میں بنیادی تبدیلی کی ضرورت ہے۔

(باقی آئندہ)

۱۱۔ اگر کوئی صاحب جمہوریت کے سیاسی پہلو کا فرید مطالعہ کرنا چاہیں تو وہ مندرجہ ذیل کتب سے استفادہ کر سکتے ہیں۔  
۱۲۔ اسلام کا نظریہ سیاسی از سید ابوالاعلیٰ مودودی۔

(۲) N. B. Mitin : Soviet Democracy and Bourgeois Democracy

(۳) Burns - Democracy

(۴) Joseph A. Schumpeter : Capitalism, Socialism and Democracy

(۵) G. D. H. Cole : Essays in social theory

(۶) Viscount Bryce : Modern Democracies

(۷) Briefs : The Proletariat

(۸) Hearnshaw : Democracy at the Crossways

(۹) H. Laski : Democracy in Crisis